# تنقید و تبصرہ

## ارمغان سلیمان

مجموعہ کلام حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام غزالیؒ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ کلام، فلسفہ، منطق اور جملہ علوم و فنون میں کمال حاصل کرنے کے باوجود انہیں آخر میں طمانیت قلب تصوف ہی میں ملی تھی۔ وہ اس زمانے کی سب سے بڑی اور مرکزی درس گاہ نظامیہ بغداد میں مدرس تھے اور اہل علم کا ان کی طرف رجوع عام تھا۔ بحیثیت ایک عالم کے ان کی یہ شان تھی کہ وزراء اور امراء تک ان کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتے تھے، ان کے درس میں علماء کے علاوہ امراء و رؤسا۔ حاضر ہوتے تھے۔ لیکن ایک وقت آیا کہ ان کی طبیعت اس شاندار علمی زندگی سے اچاٹ ہو گئی اور وہ تلاش حق میں نظامیہ کی مدرسی وغیرہ چھوڑ چھاڑ کر بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ امام صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے متکلمین باطنیہ اور فلاسفہ کے ہاں حق ڈھونڈا، لیکن ان کی کتابیں مجھے یقین نہ بخش سکیں۔ سب سے آخر میں میں نے تصوف کی طرف توجہ کی اور اس فن کی کتابیں پڑھیں، لیکن چونکہ یہ فن دراصل عملی فن ہے اس لئے صرف علم سے کوئی نتیجہ نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ اور عمل کے لئے ضروری تھا کہ زہد و ریاضت اختیار کی جائے۔ امام صاحب نے بغداد کو الوداع کہا۔ اور شام کی راہ لی۔ پھر وہ مختلف

ملکوں میں گھومتے رہے اس دوران میں ان کی زندگی سرتاپا ریاضت کی تھی۔
زیر نظر کتاب ارمغان سلیمان پڑھ کر بے اختیار امام غزالی اور ان کا د
تدریس سے قطع تعلق کرکے تصوف کے دامن سے وابستہ ہونا یاد آجاتا
ایک زمانے میں دارالمصنفین اعظم گڑھ برصغیر پاک و ہند میں اتنا ہی مشہور
جتنا کہ امام غزالی کے زمانے میں مدرسہ نظامیہ بغداد ہوگا۔ سید سلیمان صا
دارالمصنفین کے دماغ اور روح رواں تھے۔ اور علمی و تعلیمی حلقوں کے ع
سیاسی اور حکومتی اداروں میں بھی ان کی عزت تھی۔ ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۵ء ہی سے
کہ دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ پورے ملک میں اس کے نام کا غلغلہ
ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی سید سلیمان صاحب کی شہرت بھی پھیل گئی تھی۔ انہ
وفد خلافت کا رکن چنا گیا' جو مولانا محمد علی کی قیادت میں ۱۹۲۰ء میں یورپ گیا تھا
ایک اور وفد کے قائدین کر حجاز بھی گئے تھے ان کو جمعیت العلماء ہند کا صدر منتخب کی
بڑے بڑے سیاسی لیڈر ان سے تعلق رکھنے میں اپنا فخر سمجھتے تھے پھر ریاستوں کے ح
ان کے نیازمند تھے اور ان کی بات احترام سے سنتے تھے۔ غرض ایک عالم دین'
دینی مصنف اور ایک اسلامی ادارہ کے سربراہ کو جو بھی بڑے سے بڑے دنیاوی
مل سکتا تھا' سید صاحب ان سب سے بہرہ ور تھے لیکن اس کے باوجود ایک وقت آ
وہ ان سب چیزوں سے بیزار ہوگئے' اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
ہاتھ پر بیعت کرکے امام غزالی کی طرح انہوں نے تصوف میں پناہ لی' اور اس
ان کو اطمینان قلب نصیب ہوا۔

تھانہ بھون میں حضرت تھانوی کی بیعت کرنے کے بعد انہوں نے جو غزل
اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پاکر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں

ہر سود و زیان دوسرا بھول گیا ہو

جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے
ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں

آتا ہے خدا بھی ترے صدقے میں مجھے یاد
گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں

عالم کے تماشے نہیں اب جاذب دل میں
ہر لذت ہستی کا مزا بھول گیا ہوں

اب مسئلہ وحدت وکثرت کو میں سمجھا
پاکر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں

منظور تری چشم رضا جب سے ہوئی ہے
امید جزا و خوف سزا بھول گیا ہوں

اے رہبر توفیق مجھے راہ بتا دے
نقش قدم راہ نما بھول گیا ہوں

الٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا
افسانۂ پارینہ دلا بھول گیا ہوں

یہ اشعار ۵ اپریل ۱۹۴۲ء کے ہیں۔ اس کے بعد بھی اپنے مرشد سے جو انہیں روحانی فیضان ملتا رہا اس کا ذکر وہ اشعار میں کرتے رہے ہیں۔ چند اشعار اور سنئے۔

ساز گار اب گردش ایام ہے
دور میں ہشتاد سالہ جام ہے

ہشتاد سالہ جام سے مراد اسی برس کے بوڑھے مرشد تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہے۔ مرتب۔

لذت خلوت بیاں کیا کیجئے
ایک میں ہوں اور ان کا نام ہے

علم ودولت جاہ وعزت ہیچ ہیں
گر مجھے حاصل ترا انعام ہے

جب مرا مطلوب ہے تیری رضا
تب مجھے اوروں سے طلب کیا کام ہے

تھی جو آزادی تو ہر سو دوڑ تھی
قید میں آرام ہی آرام ہے

اور اس غزل کا آخری شعر ہے۔

فیض ہے یہ کس ولی وقت کا
اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

اس غزل میں ایک شعر ہے۔

اس کی دزدیدہ نگاہی کے نثار
آج ہی آغاز کا انجام ہے

مرتب اس شعر کی تشریح یوں کرتے ہیں

مرشد تھانویؒ کی نظریں عادتاً جھکی ہی رہتی تھیں مگر کبھی کبھار کن انکھیوں سے کسی سمت دیکھ لیتے تو گویا بجلی گرا دیتے تھے۔

مرتب نے سید صاحب کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ جسے موصوف نے "غزل الغزلات" کا نام دیا ہے سید صاحب کے آخری دور کا کلام ہے اور اس کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب انہوں نے حضرت تھانوی کے دست مبارک پر بیعت کی اور علم کی اقلیم سے نکل کر آسمان معرفت کی سیر شروع فرمائی۔ دوسرا حصہ سید صاحب کے دور اول کا کلام ہے۔ جس میں بعض سیاسی نظمیں ہیں، غزلیات ہیں اور مولانا شبلی کا مرثیہ "نوحہ استاد" ہے اس حصہ میں بعض تاریخی نظمیں بھی ہیں، جن سے اس دور کی جب وہ نظمیں کہی گئی تھیں، سیاسیات

کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ ایک نظم "مسٹر محمد علی جینا" کے عنوان سے ہے اس کے یہ شعر ہیں۔

اک زمانہ تھا کہ اسرار دروں مستور تھے
کوہ شملہ جن دنوں ہم پایۂ سینا رہا

جب کہ دار وئے وفا ہر درد کا درماں رہی
جب کہ ہر نادان عطائی بوعلی سینا رہا

(مسلمانوں کے اس دور سیاست کی طرف اشارہ ہے، جب انگریز کی وفاداری ان کا قبلہ مقصود تھا۔ اور شملے کے پہاڑ کو جہاں انگریز وائسرائے رہتا تھا۔ طور سینا کا ہم پایہ سمجھا جاتا تھا)

جب ہمارے پارہ فرما زہر کہتے تھے اسے
جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا

(یعنی سیاست۔ اس دور میں مسلمانوں کے ہاں سیاست شجر ممنوعہ سمجھی جاتی تھی)

بادۂ حب وطن کچھ کیف پیدا کر سکے
دور میں یونہی اگر یہ ساغر و مینا رہا

علت دیرینہ سے گو اصلی قوی بیکار ہیں
گوشِ شنوا ہے نہ ہم میں دیدۂ بینا رہا

پر مریض قوم کی جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

یہ نظم لکھنؤ میں ۱۹۱۶ء میں کہی گئی جہاں اس وقت مسٹر محمد علی جناح آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے۔

ایک شعر ۱۹۳۵ء کا ہے، جس کا عنوان ہے، درآخر خطبہ ریڈیو بہ حیدرآباد دکن، شعر یہ ہے۔

سلیماں را بملک شام اگر آصف وزیرے شد
بہ بیں ایں جاست آصف را سلیماں کمتریں چاکر

دوسرے مصرعے میں آصف سے مراد نظام حیدرآباد دکن ہیں۔ جن کے ہاں سید صاحب کا ایک زمانے میں بڑا احترام تھا۔

حصۂ غزل الغزلات کے ایک شعر میں اپنے روحانی انقلاب کی کتنی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں۔

مدرسہ چھوڑ خرابات میں آکر بیٹھا دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدرسہ کی قیل وقال سے تنگ آگئے تھے اور دارالمصنفین کی تصنیفی سرگرمیاں ان کے قلب و روح کو اطمینان بخشنے میں ناکام رہی تھیں انہیں ایک سایۂ دیوار کی تلاش تھی، اور وہی ان کو تھانہ بھون میں کھینچ لایا۔ چنانچہ مدحت شیخ میں فرماتے ہیں۔

قیل وقال مدرسہ کو چھوڑ کر
شیخ بھی رندوں میں اب شامل ہوا
آج ہی پایا مزہ ایمان کا
جیسے قرآں آج ہی نازل ہوا
ایسے کچھ انداز سے تقریر کی
پھر نہ پیدا شبۂ باطل ہوا

بزم میں دیکھا کئے اس ناز سے
جس طرف دیکھا نشانۂ دل ہوا
گھول کر کیا جانے کیا دے دیا
حلق سے اترا کہ شیدا دل ہوا
دیکھ کر سب کو اسی کو چن لیا
جو نگاہِ ناز کے قابل ہوا
قید ہاہے حلقۂ پیر مغاں
پھر نہ اٹھا، جو یہاں داخل ہوا

یہ اشعار اگر صحیح معنوں میں سید صاحب مرحوم کی باطنی کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں اور یقیناً وہ کرتے ہیں تو ان سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب کو حضرت تھانویؒ کی بیعت کرنے سے پہلے وہ روحانی سکون حاصل نہیں ہو سکا تھا، جو ایک مذہبی زندگی کی اصلی متاع ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی علمی زندگی سر تا سر قیل و قال مدرسہ تھی۔ ہمارے نزدیک بہت حد تک یہ واقعہ ہے سید صاحب کے دار المصنفین میں تاریخ نگاری تھی، سوانح نگاری تھی، لیکن یہ سب چیزیں خارجی ہوتی ہیں اور ان کی حیثیت اس وقت تک خول کی رہتی ہے، جب تک کہ ان کے پیچھے کوئی فکری و فلسفیانہ معنویت نہ ہو، اور بدقسمتی سے سید صاحب کے دور سربراہی میں دار المصنفین اس سے خالی رہا اور اس کمی کی تلافی وہ اکثر مغربیت، اور تفرنجیت، کو برا بھلا کہہ کر پوری کرتے رہے یہ ایک روحانی خلا تھا، جس کا بھرنا تھانہ بھون سے مقدر تھا چنانچہ سید صاحب مرحوم کو آستانۂ تھانوی پر جبہ سائی کرنی پڑی۔

ایک اور غزل ملاحظہ ہو، جس کے اشعار ہمارے اس خیال کی مزید تائید کرتے ہیں

زباں میری بنا دے یاالٰہی ترجمانِ دل
زباں سے ہو وہی اظہار جو کچھ ہو بیانِ دل
زباں تسبیح میں شاغل دل اس کی یاد سے غافل
لبوں پر ذکر حق جاری مگر ساکت زبانِ دل

زباں تحلیل میں ترے خیالوں میں چھپا دل ہے — نہ کھل جائیں کہیں یارب یہ اسرار نہان دل

زباں تاثیر کی طالب ہے دل تاثیر سے خالی — زباں میں ہے نہ دل شامل ، دل میں ہے زبانِ دل

خدا جانے کہاں دل ہے کہاں پر اس کی منزل ہے — نہیں ملتا سراغ دل، نہیں ملتا نشانِ دل

کوئی چوٹ ایسی لگ جائے الٰہی میرے سینے میں — کہ فوارہ سا بن جائے یہ زخم خونچکانِ دل

اگر ساقی تری چشم فسوں گر کام کر جائے — بدل جائے نظامِ دل بدل جائے جہانِ دل

کشاکش ہائے رنگا رنگ سے چھوٹوں قرار آئے — مقیم اس گھر میں ہو جائے اگر یہ میہمانِ دل

دو دل ہے سے خرد کے جب سے آیا ہوں رہ دل پہ — یقیں کی شکل بنتا جا رہا ہے ہر گمانِ دل

تری ساقی کرامت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی
زبان میری لگی اک گھونٹ میں کرنے بیانِ دل

۱۳ اپریل ۱۹۴۲ء

بے شک اس مجموعہ میں شاعری کی بلندیاں آپ کو کم ملیں گی، لیکن اس دور کے سب سے بڑے مدرسہ کی ........ ناکامی کی یہ ایک منہ بولتی تصویر ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

بڑا سائز، ضخامت ۱۱۲ صفحے، غیر مجلد قیمت ۳ روپے

ملنے کا پتہ سید محی الدین احمد عالمگیر روڈ مشرف آباد کراچی

(ا - س)